سہ ماہی

تاریخ

38

ایڈیٹر
ڈاکٹر مبارک علی

مجلس مشاورت

ڈاکٹر جعفر احمد
ڈاکٹر پرویز وندل
ڈاکٹر روبینہ سہگل
اشفاق سلیم مرزا
ہما غفار

ڈاکٹر طارق رحمان
ساجدہ وندل
غافر شہزاد
احمد سلیم

THAAP
TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
PUBLICATIONS

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: 0426665997
ای میل: mubarakali21@yahoo.com

قیمت فی شمارہ غیر مجلد : 225 روپے
قیمت فی شمارہ مجلد : 270 روپے
سرورق : لالہ رخ
اہتمام : ESNA Services- 0333-4769230
پرنٹرز : شاہ محمد پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت : اپریل 2009

THAAP PUBLICATIONS TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
43 G-Gulberg III, Lahore
Tel: 042-5880822, Fax 042-5725739,
email:thaappublications@gmail.com

فہرست

ابتدائیہ		4
1- ہم عصر تاریخ کا چیلنج	رام چندر گوھا/ مترجم: نوین جی حیدر	5
2- استدلال اور تاریخ	عرفان حبیب / مترجم: ہما غفار	37
3- جنوبی ایشیائی ماضی کی جستجو	رومیلا تھاپر / مترجم: انور شاہین	57
4- آئیڈیالوجی کی آڑ میں سطحی مذہبیت	ڈاکٹر مبارک علی / مترجم: انور شاہین	77
5- ایڈورڈ سعید: ایک تنقیدی جائزہ	عرفان حبیب / مترجم: ڈاکٹر ناظر محمود	85
6- ہندو اور اسلامی ماورائے قوم مذہبی تحریکیں	شیل مایا رام / مترجم: ڈاکٹر ریاض شیخ	93
7- سولہویں صدی میں شمالی ہندوستان کے مسلح کسان	وندانہ کاؤشک / مترجم: محمد عابد عباسی	123
8- بحر ہند میں اولین تجارتی سرگرمیاں	اشفاق سلیم مرزا	131
9- اسلامی آرٹ کی جمالیات	غافر شہزاد	142
10- مزاحمتی تحریکیں اور ان کے سماج پر اثرات	ڈاکٹر مبارک علی	148
11- عصبیت اور پنجاب کی بلدیاتی سیاست	چودھری ظہور احمد	158
12- ملتان میں سومرا حکمرانوں کا سنہری دور	حفیظ خان	182
گوشۂ کوسمبی		
1- ہندوستان قدیم تاریخ اور ڈی ڈی کوسمبی کی تحقیقی اہمیت	رومیلا تھاپر / مترجم: طفیل ڈھانہ	203
2- کوسمبی، مارکسزم اور ہندوستان کی تاریخ	عرفان حبیب / مترجم: طفیل ڈھانہ	231
نقطۂ نظر		
1- انٹرویو: احمد سلیم	عارف	242

ابتدائیہ

تاریخ کا 38 شمارہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ سے یہ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔

اس شمارے میں حسب معمول دوستوں کی مدد شامل رہی۔ خصوصیت سے ڈاکٹر جعفر احمد پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی کے ساتھیوں نے بڑے اہم مضامین کے ترجمے کیے۔

ان میں انور شاہین، نوین جی حیدر اور ہما غفار شکریہ کی مستحق ہیں۔ میں ڈاکٹر ریاض شیخ، ڈاکٹر ناظر محمود اور محمد عابد عباس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے وقت نکال کے مضامین کے ترجمے کیے۔

تاریخ کی اہمیت کے بارے میں ہم پچھلے شمارے میں مضامین شائع کر چکے ہیں۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک تاریخی شعور پختہ نہیں ہوگا ہم تاریخ کے عمل کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ یہ شمارہ بھی اسی کوشش کی ایک کڑی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

مارچ 2009

لاہور

ہم عصر تاریخ کا چیلنج

رام چندر گوھا
مترجم: نوین جی حیدر

زیرِ نظر مضمون اس تضاد پر تحقیق کرتا ہے اور ساتھ ہی اس پر تاسّف کا اظہار کرتا ہے کہ اگرچہ ہندوستان دنیا کا سب سے دلچسپ ملک ہے مگر ہم ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اس کی تاریخ سے بہت کم واقف ہیں۔ یہ مضمون ہم عصر تاریخ نگاری میں رکاوٹوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور یہ تجویز بھی پیش کرتا ہے کہ ان پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ بعض اہم تحقیقی موضوعات کی تجویز بھی پیش کرتا ہے، جس میں ریاستوں کی تاریخیں، اداروں کی تاریخیں اور مصنفین اور باعمل افراد کی سوانح شامل ہیں۔ آخراً، یہ [مضمون] تجویز دیتا ہے کہ چونکہ نوآبادیات کے مطالعے کی افادیت گھٹنے کی طرف مائل ہے، ہم عصر تاریخ مستقبل کے لیے فائدے کا میدان، ہوسکتی ہے یا شاید اسے ہونا ہی چاہیے۔

تاریخ کو، اصولی طور پر، مضامین کی دیگر شاخوں سے اس کے معلومات کے جمع کرنے کے طریقے کی بناء پر الگ کیا جاتا ہے۔ روایتاً اور رسماً مؤرخین [دستاویزات و یادداشتوں کے] آرکائیوز [Archives] میں کام کرتے ہیں، ماہرِ سماجیات، فیلڈ ریسرچ کرتے ہیں اور ماہرِ

معروف تاریخ داں رام چندر گوہا (Ramchandra Guha) کا یہ مضمون The Challenge of Contemporary History کے عنوان سے Economic & Political Weekly کی اشاعت ۲۸ جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ۲۱ نومبر ۲۰۰۷ء کو چنائی (مدراس) میں Malcolm Adiseshiah Memorial Lecture کے طور پر پیش کیا گیا (ادارہ)۔

سیاسیات جائزے پیش کرتے ہیں۔ ہندوستانی مطالعاتی حلقے میں، بہرحال، یہ حد بندی ایک واحد لمحۂ وقت کی وجہ سے بھی نمایاں ہے۔ نتیجتاً، اگست ۱۹۴۷ کو ۱۴ اور ۱۵ تاریخ کی درمیانی شب جب گھڑی نے حرکت کی تو ہندستان آزاد ہوا (اور تقسیم بھی)، تاریخ کا خاتمہ ہوا، اور سیاسیات اور سماجیات کا آغاز۔[۱] آزادی کے ابتدائی سالوں میں یہ تقسیم معقول تھی۔ برطانوی راج کا حتمی طور پر خاتمہ ہوگیا تھا، چنانچہ اس کو 'تاریخ' کے طور پر برتا جاسکتا تھا۔ نئی قوم وجود پذیر ہوگئی تھی، اس کے بننے (اور نہ بننے) کا ماہرِ نسلیات [ethnographer] اور ماہرِ سیاسیات کے شراکتی طریقوں کے ذریعے نتیجہ بخش مطالعہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر جب پچاس کی دہائی ساٹھ میں اور ساٹھ کی ستر میں تبدیل ہوئی تو اس تقسیم کا جواز کم رہ گیا۔ مگر پھر بھی یہ [تقسیم] جاری رہی۔ یہاں تک کہ اب، آزادی کو ساٹھ برس گزرنے کے بعد، بھی ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء ایک 'لکشمن ریکھا' ہی ہے، جس کو تقسیم کے دونوں جانب وفاداری سے نبھایا جارہا ہے۔ ہندوستانی مؤرخین اس تاریخ [۱۵/اگست ۱۹۴۷ء] کی حد نہیں پھلانگتے۔ ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ سیاسیات اس تاریخ سے آگے نہیں جھانکتے۔[۲]

۱۔ ایک تضاد اور ایک معمہ

اس ایک تاریخ، ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء، کو تحقیق و تدریس میں حد سے زیادہ اہمیت دینا ایک تضاد کی طرف لے جاتا ہے ___ مثلاً، یہ کہ اگرچہ ہندوستان دنیا کا دلچسپ ترین ملک ہے، تاہم ہمیں اس کی جدید تاریخ کے بارے میں بہت کم پتہ ہے۔ اور جو کچھ ہم آزاد ہندوستان کے بارے میں جانتے ہیں وہ بنیادی طور پر ماہرینِ سماجیات، معاشیات، سیاسیات اور صحافیوں کا کام ہے ___ نہ کہ مؤرخین کا۔ درحقیقت، ۱۹۴۷ء [کے بعد] سے ہندوستان کے کسی بھی پہلو پر صحیح معنوں میں، نام نہاد، تاریخی کام اتنے چند محض ہیں کہ ان کو ایک ہاتھ یا پھر، زیادہ سے زیادہ، دو ہاتھوں کی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔[۳]

یہ تضاد ایک معمہ بھی ہے۔ کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ بحیثیت ایک تدریسی شعبے کے تاریخ ہندوستان میں پسماندہ ہے۔ اس کے برعکس، ہندوستانی مؤرخین کا ایک وسیع اور آشکار گروہ ہے، اتنا وسیع اور اس قدر آشکار کہ، درحقیقت، یہ اپنے ہمکار سماجیات اور سیاسیات کے لیے رشک کا سبب بنتا ہے۔ ان مؤرخین میں ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ برطانوی، امریکی، فرانسیسی، اور

جاپانی بھی شامل ہیں۔ بعض مارکسی ہیں، دوسرے مابعدِ مارکسی یا محکوموں کی تاریخ لکھنے والے، پھر دوسرے جو غیر نظریاتی ہونے کے دعوے دار ہیں، اور صرف مشاہداتی تحقیق کے قوانین سے وفادار۔ باہم پرزور مباحثات کرتے ہوئے، یہ مؤرخین مفکرین کی ایک تعجب انگیز حد تک کار آمد برادری کی تشکیل کرتے ہیں، جنہوں نے الحاقِ ہندوستان کی سرحدوں کے باہر بھی علمی مباحث کو متاثر کیا ہے۔

ہندوستانی ماہرینِ معاشیات سے بھی شاید زیادہ، ہندوستانی مؤرخین نے عالمی علم پر اپنا اثر مرتب کیا ہے۔ ان کی دلچسپی کا مخصوص میدان نوآبادیات، یا، اگر زیادہ درستی سے کہا جائے تو، نوآبادیات اور قومیت کے درمیان ہونے والی مڈبھیڑ رہا ہے۔ آزاد ہندوستان پر ہونے والے گنتی کے کاموں کے تقابل میں، شاید کئی ہزار کتابیں اور مضامین برطانوی ہند کی تاریخ پر ہیں۔ ان میں انتہائی گہرائی تک کھدے ہوئے میدان، وائسرایوں کی اعلیٰ سیاست اور انگریزی بولنے والے قومیت پرست، کسانوں اور مزدوروں کی محکومانہ سیاست، پانی؛ جنگل اور جنگلی حیات کی ماحولیاتی تاریخیں، زرعی اور صنعتی ڈھانچوں کی معاشی تاریخیں، گھروں اور کارخانوں میں عورتوں کی نسائی تاریخیں، اور فن، فنِ تعمیر، اور ادب کی ثقافتی تاریخیں ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی ایک انتہائی مالا مال اور بہت ہی گوناگوں میدان ہے۔ مگر ایک محدود میدان بھی ہے۔ کیونکہ اس نے مضبوطی سے ــــ بعض کے مطابق لگاؤ کی حد تک ــــ اپنے آپ کو 'پلاسی سے پارٹیشن [تقسیم]' (یہ ایک حال ہی میں شائع شدہ مضمون کے عنوان سے مستعار لیا گیا ہے) ۱۹۴۷ پر مرکوز رکھا۔ وقت کے دائرے کی اس تنگی کی ایک قیمت، درحقیقت دوہری قیمت، ادا کرنی پڑی۔ حالیہ سالوں میں مؤرخین نے ایک طرف نوآبادیات کی جانب اس انتہائی لگاؤ کو اس کی پچھلی حد ــــ یعنی ۱۷۵۷ء سے پہلے ہندوستانی تاریخ ــــ کو چیلنج کرنے کا آغاز کیا۔ حالیہ وقتوں میں اس لگاؤ کو تقسیم کی دوسری حد ــــ یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد کے عہد کی ہندوستانی تاریخ ــــ سے بھی چیلنج کیا جا رہا ہے۔

۲۔ بعض چیزیں ہم نہیں جانتے۔۔۔

میں نے آزاد ہندوستان کا حوالہ بحیثیت دنیا کے دلچسپ ترین ملک کے دیا۔ یہ ایک مؤرخ کا غیر جانبدارانہ فیصلہ ہے، نہ کہ ایک شہری کا جانب دارانہ دعویٰ۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ

ہندوستان دنیا کا انتہائی اشتعال انگیز، درجہ بند اور پست ترین ملک بھی ہو۔ مگر کوئی کسی بھی اہلیت یا صفت کو استعمال کرے یا ترجیح دے، یہ [ہندوستان] ایک انتہائی دلچسپ ملک بھی رہتا ہے۔ یہ 'دلچسپ ہونا' اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ انتہائی وسیع اور گنجان آباد ہے، اس میں دنیا کے ۱/۶ فیصد انسان بستے ہیں، یہ کہ یہ علاقہ حیران کن حد تک متنوع ہے، اس کے لوگوں کا [باہم] مذہب اور زبان اور ذات اور نسل کے ساتھ ساتھ ماحولیات اور فنیات اور لباس اور طباخی میں فرق ہے، اور یہ کہ یہ وسیع اور متنوع آبادی بیک وقت چار بنیادی تغیرات سے گزر رہی ہے۔ ہندوستانی معیشت کی بنیاد کبھی بڑی حد تک زراعت پر تھی۔ اب، بڑی حد تک اس کا دارومدار صنعت اور پیشہ واریت پر ہے۔ ہندوستانیوں کی ایک بڑی اکثریت کبھی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ اب، زیادہ سے زیادہ ہندوستانی شہروں اور قصبوں میں رہائش پذیر ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کبھی ایسا علاقہ تھا جس پر یورپیوں نے اپنی نوآبادی اور اقتدار جمایا ہوا تھا۔ اب، یہ ایک آزاد اور مطلق العنان ملک ہے۔ کبھی ہندوستان کا سیاسی تمدن جاگیرداری اور تعظیمی تھا۔ اب، یہ مقابلہ جاتی اور اشتراکی ہے۔

چار انقلابات ہندوستان میں بیک وقت پیش آ رہے تھے، اور ہیں: شہری انقلاب، صنعتی انقلاب، قومی انقلاب، اور جمہوری انقلاب۔ یہاں پر کلیدی لفظ ہے 'بیک وقت'۔ یورپ اور امریکہ میں، مثال کے طور پر، یہ انقلابات مرحلہ وار تھے۔ امریکہ پہلے قوم (یا کم از کم اپنی قومی آزادی کے اعلان کی حد تک) اٹھارویں صدی میں بنا۔ شہری اور صنعتی انیسویں صدی میں۔ اور صرف بیسویں صدی میں، جب پہلے عورتوں کو اور پھر سیاہ فام لوگوں کو رائے دہی کا حق بخشا گیا، جمہوری بنا۔ یورپ میں [جب]، ایک برِاعظم مختلف قومیتوں میں بکھرا، [تو] ان ملکوں کے درمیان اور ان کے اندر بھی ان مختلف انقلابات کی رفتار میں فرق تھا۔ قطعی طور پر، ہر ملک میں قومی انقلاب جمہوری انقلاب سے کئی عشرے یا اس سے بھی زیادہ مقدم رہا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ، جغرافیائی لحاظ سے معین اور محدود علاقے کے رہائشیوں کو اس سے کہیں پہلے کہ یہ حق دیا جاتا کہ وہ اُس شخص کا انتخاب کریں جو ان کی رہنمائی اور انتظام کرے، وہ ایک واحد جھنڈے اور کرنسی کے تحت مجتمع ہوئے۔

ہندوستان کی آبادی امریکہ سے تین گنا زیادہ ہے، اتنی بنیادی بولیاں ہیں جتنی کہ یورپ

کی، اور اس میں امریکہ یا یورپ سے کہیں زیادہ مذہبی گونا گونی ہے۔ علاوہ ازیں، یہ بیک وقت جمہوری اور قوم بنا (اپنے عظیم ایشیائی پڑوسی چین کے برخلاف)۔ بہرصورت، شہری اور صنعتی انقلابات تصادم اور فشار پیدا کر سکتے تھے (جیسا کہ انہوں نے دنیا میں اور جگہ کیا) - مگر صرف ہندوستان ہی میں [ایسا ممکن ہوا کہ] اس تصادم اور فشار کا بیان سیاسی تحریک اور خطیبانہ تاثرات کے طریقۂ عمل کے ذریعے کیا گیا، جس کی ایک جمہوریت نہ صرف اجازت دیتی ہے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔ اس کے علاقے کی قامت جمع [+] اس کے لوگوں کی گونا گونی جمع ان چار عظیم سماجی انقلابات کی ہمہ وقتی ___ یہی وہ ہے جو ہندوستان کو دنیا کا سب سے دلچسپ ملک بناتی ہے۔

ذات پات اور انتخابات

بہر حال، راج کے عہد پر توجہ مرکوز کر کے، ہندوستانی مؤرخین کے ایک کثیر اور انتہائی لطیف طبقے نے بڑے پیمانے پر ان متعدد تحریکات کو نظر انداز کیا ہے۔ مثال کے طور پر اُن دو لفظوں، درجہ بندیوں، اور طریقۂ عمل کو ہی لے لیجئے جو جدید ہندوستان کی تاریخ کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، یعنی 'ذات پات' اور 'انتخابات'۔ ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ بشریات نے آزادی سے لے کر ہر عشرے میں ذات پات پر متعدد فیلڈ مطالعات کیے۔ انہوں نے یک-ذاتی اور کثیر- ذاتی دیہاتوں، نچلی ذاتوں، جیسا کہ مچھیروں اور گڈریوں، پر کام کیا۔ انہوں نے ذات پات کے نظام اور زرعی معیشت کے درمیان، اور ذات پات اور سیاست کے درمیان تعلقات کی تحقیق کی۔ اسی طرح ماہرینِ سیاسیات نے آزادی کے بعد ہر انتخابات کے وقت تجزیے اور رائے شماری کروائی۔ بعض اوقات ان کی توجہ ایک حلقے پر مرکوز رہی، تو دوسرے وقت میں ایک پوری ریاست میں پارٹیوں کے درمیان مقابلے کی حرکیات [dynamics] پر۔ ماہرین نے ووٹ دہندہ کے رویوں، طریقۂ مہم، مالی ذرائع اور کئی اور [پہلوؤں] پر تحقیق کی۔

اب تک، یقیناً، آزاد ہندوستان میں ذات پات پر سینکڑوں کتابیں ہوں گی، اسی طرح سے سینکڑوں مضامین انتخابات پر ہوں گے۔ اس کے باوجود ہمارے پاس کسی مؤرخ کا کوئی ایسا واحد کام نہیں جس میں آزادی کے بعد سے ذات پات کے نظام کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہو، یا

اس کی توجیہہ کی گئی ہو۔ نہ ہی کوئی ایسا تاریخی مطالعہ جو ان ساٹھ سالوں میں انتخابات اور انتخابات کے طریقۂ کار میں ہونے والی تبدیلیوں پر ہماری سمجھ میں اضافہ کر سکے۔

ماہرِ سماجیات جان گولڈتھورپ (John Goldthorpe) نے استدلال کیا ہے کہ اس کیشعبے کو ایک برتری یہ حاصل ہے کہ یہ فیلڈ ورک، انٹرویو، اور جائزوں کے ذریعے خود اپنے ثبوت پیدا کرتا ہے۔ مؤرخ، ان کے خیال کے مطابق، مُردوں کی دنیا، جسے گولڈتھورپ 'باقیات'[۶] کہتا ہے، پر دارومدار کی بناء پر محدود ہوجاتا ہے۔ مگر وہ سکّے کے دوسرے رخ کا ذکر نہیں کرتا۔ جیسا کہ، واقعتاً اسی لیے ہی کہ وہ لوگ زندوں کی دنیا سے متعلق ہوتے ہیں، ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ سیاسیات مستقبل کے بارے میں پیشگوئیوں میں بہک جاتے ہیں جو کبھی کبھار، یا شاید عام طور پر، غلط ثابت ہوتی ہیں۔ علمِ سماجیات کا قبرستان ناکام پیشگوئیوں کی باقیات سے بکھرا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر مذہب کی عوامی زندگی سے پسپائی کے بارے میں ماہرینِ سماجیات کی پیشگوئی، یا ماہرینِ سیاسیات کی کسی مخصوص سیاسی جماعت یا سیاسی ادارے کے ناپید ہوجانے کے بارے میں پیشگوئیاں۔

دوسری جانب، چونکہ ان کا واسطہ ماضی سے، اور چنانچہ ایک تکمیل شدہ سماجی عمل سے ہے، مؤرخین ایسے مقام پر ہیں کہ وہ کسی مخصوص معاشرے کے کسی مخصوص حصۂ وقت کے بارے میں معقول حد تک سوچے سمجھے فیصلے صادر کر سکیں ___ اس پر کہ وہاں کیا ہوا تھا، یہ کیسے ہوا تھا، اور اس کی دورس اہمیت کیا ہے۔ مؤرخ کے لیے شواہد کے غیر مکمل اور/یا ٹکڑوں میں ہونے کی نوعیت کا تدارک واقعے کے مکمل بیان کی صورت میں ہوجاتا ہے۔ اگر مضامین کے زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو مؤرخین کے رجحانات ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ سیاسیات سے مختلف ہیں، مگر اگر مجموعی انسانی علم کے زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔

ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ سیاسیات کے مطالعات، چاہے وہ ذات پات اور/یا انتخابات سے متعلق ہوں، تمام ایک مخصوص وقت میں کئے گئے ہوئے ہوتے ہیں، یعنی ایک و احد لمحہ وقت میں۔ ایک تاریخی رجحان اس لحاظ سے مختلف ہوگا کہ وہ تاریخی تسلسل کا حامل ہوگا، یا وقت میں پھیلا ہوا۔ یہ استعمال ہونے والے مآخذ کی نوعیت اور اقسام میں بھی مختلف ہوگا۔ چنانچہ، مثال کے طور پر، انتخابات کی سماجی تاریخ لکھنے والا ایک مؤرخ ماہرینِ سیاسیات کے

مطالعات سے فائدہ اٹھائے گا، اور اس کو مزید معتبر بنانے کے لئے غیر شائع شدہ مخطوطات (چاہے وہ ذاتی ہوں یا سرکاری)، جریدوں کے مضامین (انگریزی اور دیگر زبانوں میں)، پوسٹروں اور کتابچوں اور زبانی تاریخوں سے استفادہ کرے گا۔ واقعے کے کئی سالوں یا عشروں کے بعد [اس پر] لکھنے سے مؤرخین کو وہ دوری اور غیر وابستگی میسّر ہوجاتی ہے جو ایک شریکِ کارِ مشاہدہ کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ پس منظر اور پیش منظر کا ایک تصور تخلیق کرے اور اس کے لئے مختلف النوع مآخذ کو پارٹی کے چندے، یا اشتہاری مہم اور فنِ خطابت کی اقسام، یا ووٹ دہندہ کی حرکت پذیری، یا انتخابات کے دوران تشدد اور جرائم کے واقعات کے تبدیل ہوتے ہوئے طریقوں کا سراغ لگانے کے لئے استعمال کرے۔ اسی طریقے پر، ایک مفکر [جو] آزادی کے بعد سے ذات پات کی ایک تاریخ لکھ رہا ہو، وہ اس انتہائی متاثر کن سماجی ادارے کے بدلتے ہوئے کردار اور اس کی اہمیت کی توجیہہ کے لیے ماہرینِ سماجیات کے چھپے ہوئے کام کا تقابل اخبارات اور تحقیقی رسالوں کی شہادتوں، عدالتوں کے ریکارڈز (عائلی اور فوجداری)، پارلیمان اور مقننہ کی کاروائیوں سے بھی کرے گا۔

ہمیں ایک بھی ایسی کتاب دستیاب نہیں جو آزاد ہندوستان میں ذات پات کی سماجی تاریخ پر مشتمل ہو، اور نہ ہی ایک کتابِ واحد ہندوستانی انتخابات کی سماجی تاریخ پر موجود ہے۔ مگر یہ عدم توجہی اس سے کئی زیادہ گہرائی تک جاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں سال ۲۰۰۶ء کو ہندوستانی ریاستوں کی تنظیمِ نو کی پچاسویں سالگرہ کے طور پر منایا گیا۔ عام صورتِ حال میں، سالگرہیں تاریخی کاموں کے شائع کرنے میں محرک ہوتی ہیں ___ یاد کیجئے کہ کتنی کتابیں ۱۹۹۷ء میں تقسیمِ ہند کی یاد منانے یا اس [واقعے] پر ملامت کرنے میں شائع ہوئیں؟ ۸ اور پھر بھی، ہندوستانی ریاستوں کی تشکیل کی پچاسویں سالگرہ کو صریح خاموشی کے ساتھ منایا گیا۔ ہندوستان کی اٹھائیس ریاستوں میں کسی میں بھی بسنے والے، کسی بھی مؤرخ نے اس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی کہ جس میں وہ کام کر رہا تھا اس ریاست کی ایک سماجی، یا سیاسی، یا ثقافتی ___ یا 'جامع' ___ تاریخ لکھے۔

ہندوستان کی بعض ریاستیں کسی بڑے یورپی ملک سے بھی بڑی ہیں۔ ان کی تاریخ اتنی ہی رنگارنگ اور متلاطم ہے جتنی، مثال کے طور پر، فرانس یا جرمنی کی جدید تاریخیں۔ مگر، جبکہ آپ کو

پچاس یا سو معیاری تاریخیں مابعدِ جنگ فرانس کی مل جائیں، مگر ۱۹۴۷ء میں اس کے قیام کے بعد مغربی بنگال کی ایک واحد تاریخ بھی نہیں ہے۔ میں نے اس مخصوص ہندوستانی ریاست کا حوالہ اس وجہ سے دیا کہ اس کی مؤرخین کی ایک متحرک کمیونٹی ہے۔ ان مؤرخین نے، تقریباً مکمل طور پر، اپنے آپ کو نوآبادیاتی دور تک محدود کرلیا ہے۔ سینکڑوں کتابیں اور پی ایچ ڈی مقالے برطانوی بنگال کے زرعی ڈھانچے پر ہیں، مگر ایک بھی تاریخی مطالعہ ___ جہاں تک میری معلومات ہے ___ ۱۹۴۷ء کے بعد کے بنگال کے زرعی نظام پر نہیں ہے۔ اس پہلو سے، کم از کم، آج کا باقی ہندوستان بھی وہی سوچتا ہے جو آج کا بنگال سوچتا ہے۔ تھریوونانتھپورم [Thiruvananthapuram] کی کتاب کی ایک دکان میں جایئے، اور وہاں آپ کو نوآبادیاتی مالا بار اور تراون کور کے مہاراجہ کی تاریخیں، قدیم ضلعی گزیٹیر اور دستی نسخے ملیں گے، مگر جدید کیرالہ کی ایک بھی تاریخ نہیں ملے گی۔ جب ترقی یافتہ ہندوستانی فکری ثقافتیں اتنی کاہل رہی ہیں تو پھر ہم گجرات اور کرناٹک سے کسی معتبر تاریخوں کی اُمید کیوں کر قائم کر سکتے ہیں۔

سوانح

اب تاریخ سے سوانحوں کی طرف آیئے۔ ہمارے شہرت یافتہ 'قومی' رہنماؤں، جیسا کہ جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، اور سی۔ آر۔ راجہ گوپال اچاری (راجہ جی)، کی چند لطیف سوانح ہیں، جو جانے مانے مؤرخین اور سوانح نگاروں نے تحریر کی ہیں۔ چونکہ ان کا موضوع بننے والی تمام شخصیات کی وفات ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی، ان کی سوانح آزاد ہندوستان کی تاریخ اور سیاست کی بھی تصویر پیش کرتی ہیں۔[۹] دوسری نسل کے قومی رہنما، مثال کے طور پر اندرا گاندھی اور جے پرکاش نرائن، کی بھی کارآمد سوانح لکھی گئیں، تاہم، صحافیوں کی جانب سے نہ کہ مؤرخین کی۔[۱۰]

اگرچہ ان مرکزی قومی رہنماؤں پر لکھا گیا، لیکن ایک گہری تاریخی سمجھ کے لیے ان پر کہیں زیادہ کچھ، اور کئی مختلف زاویوں سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں پٹیل کی ایک سوانح (یہی کچھ اب تک ہمارے پاس ہے) کی نہیں بلکہ کم از کم آدھے درجن کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ، ہمیں ان رہنماؤں کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ان مخالفتوں اور تنازعات پر روشنی پڑ سکے جن کا انہوں نے آغاز کیا یا جن پر ردِعمل کیا۔ حوالے کے طور پر، نوآبادیاتی ہندوستان کا ایک طالبعلم کافی کچھ اس بارے میں جانتا ہے کہ جناح اور نہرو کے

درمیان ہندو۔ مسلم سوال پر کیسا اختلاف تھا۔ یا گاندھی اور امبیدکر کے درمیان ذات پات کے نظام کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں کیسا عدم اتفاق تھا۔ بہرحال، آزاد ہندوستان میں نہرو اور راجہ جی کے درمیان معاشی پالیسی، یا اندرا گاندھی اور جے پرکاش نرائن کے درمیان ریاست کے صحیح کردار پر مباحث کا کیا؟ کیا ہمیں ان کے بارے میں بھی پتہ نہیں ہونا چاہیے؟ کم ازکم ۱۹۷۰ء کی دھائی تک، ہندوستانی سیاست میں ایک قوی اخلاقی اور نظریاتی روح تھی ___ وہ تب تک مکمل طور پر متشکک المزاج اور آلۂ کار نہیں بنا تھا، جیسا کہ وہ آج ہے۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں کی پالیسیاں اور سیاسی مباحث اپنے آپ ہی میں دلچسپ ہیں۔ اس سے بھی اہم یہ کہ ان کا قوم کے مستقبل پر ایک فیصلہ کن اثر تھا۔

مرکزی 'قومی' رہنماؤں کو مؤرخین اور سوانح نگاروں نے مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا۔ بہرحال، اگر آپ 'قوم' سے ایک درجہ نیچے آئیں تو آپ مکمل خلا میں آجاتے ہیں۔ اگر آپ تذکروں اور پارٹی کتابچوں کی توقع کریں، جو کہ کرنا چاہیے، تو ای۔ایم۔ایس نمبودیریپد (Namboodiripad)، سی۔ این انادورائے (Annadurai)، شیخ عبداللہ، اے۔ زیڈ فزو (Phizo)، یا گروتارا سنگھ جیسی شاندار اور تاریخی طور پر اہم شخصیات کی کوئی سوانح نہیں ہیں۔

پورے ہندوستان کے زاویۂ نظر سے سی۔ ایم۔ ایس اور انتا جیسوں کو 'صوبائی' سیاست دان شمار کیا جائے گا۔ مگر ان کے صوبے کا رقبہ ایک بڑے یورپی ملک جتنا ہے۔ ان رہنماؤں نے، اچھے یا برے، چار سے پانچ کروڑ لوگوں کی زندگی مرتب کی ہے۔ ان کی پالیسیوں نے ان ریاستوں، جہاں وہ رہتے اور قیادت کرتے تھے، کی معاشی، سماجی وثقافتی تاریخوں کو گہرے طور پر بدلا۔ جموں اور کشمیر کی تاریخ، جس کا مطلب ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ بھی ہے، کے ہر بنیادی موڑ پر آپ کو شیخ عبداللہ کا یا اس جماعت (اور سیاسی سلطنت) کا ہاتھ نظر آئے گا جس کی بنیاد اس نے رکھی۔ اسی طرح کا حال نیمبودیریپد اور کیرالہ یا ہندوستانی کمیونزم کی تاریخ کا ہے۔

یہ کہ ہمارے پاس اس طرح کے ہندوستانیوں کی سوانح نہیں ہیں صرف ہمارے تاریخی تصورات کی غربت پر دلالت کرتی ہے۔ کیرالہ کے ای۔ایم۔ایس یا کشمیر کے عبداللہ کی

زندگیوں کے بارے میں پڑھنے سے قاصر ہونا ایسا ہی ہے کہ آپ فرانسیسی ہیں اور آپ نے چارلس ڈیگال کی ایک بھی سوانح نہیں پڑھی۔ ڈیگال کی طرح، یہ افراد بھی، تاریخی نقطۂ نظر سے، اتنے اہم ضرور ہیں کہ نہ صرف ایک بلکہ کئی سوانحوں کے مستحق۔

وہ افراد جن کا اوپر کے پیراگرافوں میں ذکر ہوا وہ تمام مخالف کیمپ کی شخصیات تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو مرکزی حکومت اور، بعض صورتوں میں، ہندوستانی وفاق کی مخالفت میں کھڑا کیا۔ مگر ان دیگر بااثر سیاسی شخصیات کی سوانح بھی نہیں ہیں جنہوں نے نظام کو نہیں 'للکارا'، مگر اس [نظام] کو اندر سے بدلنے اور قابلِ کار بنانے کے لیے کام کیا۔ یہاں میرے ذہن میں کے۔ کامراج، چوہدری چرن سنگھ، دیوراج عرس، اور کرپوری ٹھاکر جیسے ہندوستانیوں کے نام ہیں، جن کی زندگی اور کام نے بھی کئی لاکھ لوگوں کو متاثر کیا۔

مگر صرف سیاست دانوں کی ہی زندگیوں کے بارے میں مؤرخین کو تحقیق اور تحریر نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر، درمیانے رتبے کی ایک شخصیت، جس کی زندگی اور کام دونوں [طبقوں]، یعنی بالا و زیریں، ایک فیصلے کرنے والے بڑے آدمی اور ایک جھکے ہوئے کسان اور مزدور، کو چھوتا ہو، کو سرِ آغاز بنا کر ایک معاشرے کی زندگی پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں تین ایسے لوگ، مہم جو صحافی اور فلم کار، پی۔ کے اتر (Atre) ناول نگار اور سرگرمِ عمل مہا سویتا دیوی (Mahasweta Devi)، اور ناول نگار، صحافی، فلم کار اور سرگرمِ عمل کوٹا شورام کرنتھ (Kota Shivarama Karanth) ہیں۔ آپ جدید مہاراشٹر کی ایک شاندار سماجی تاریخ اتر کے ذریعے لکھ سکتے ہیں، یا مہاسویتا کے ذریعے جدید بنگال کی، یا کرنتھ کے ذریعے جدید کرناٹک کی۔ ان ناموں کو صرف تصویر کشی کے مقصد کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یقیناً ایک ایسے ملک میں جو اتنا وسیع اور دلچسپ ہو، آپ تیس یا اس سے زائد ایسے ہندستانی مصنفین اور مفکرین کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، جن تمام نے، زیادہ نازک اور ذمے دار فکری ماحول میں، پہلے ہی اپنے سوانح نگار پالئے ہوں۔[11]

معاشی پالیسی

اب سوانح سے پالیسی کی طرف چلئے۔ یہ روایتی سوچ ہے کہ معاشی ترقی کا آمرانہ [autorkic] نمونہ، جس میں ریاست کو 'اعلیٰ اختیار' حاصل ہوتا ہے، جس کو پچاس کی دہائی میں

اپنایا گیا، نتیجہ تھا ہمارے پہلے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو کی ترجیحات اور تعصّبات کا۔ درحقیقت، یہ دعویٰ کہ نہرو نے ایک ریاستی کنٹرولڈ معیشت کو غیر رضامند قوم پر تھوپا یہ وہ دعویٰ ہے جو مکمل طور پر آج کے صنعت کاروں کے تعصّبات اور ترجیحات پر مبنی ہے۔ نہرو کے عہد کے صنعت کار کسی طرح بھی آزاد (Laissez-faire) نہیں تھے۔ اپنے بمبئی پلان میں انہوں نے خود ایک سخت اور مداخلتی ریاست کا تقاضہ کیا تھا۔ وہ اس حد تک گئے کہ انہوں نے کیمبرج کے ایک ماہرِ معاشیات اے۔سی پیگ (Pigou) کا یہ حوالہ پیش کیا کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کو ایک مشترکہ ملاپ کا میدان تلاش کرنا پڑے گا۔ اور، نہرو اور بمبئی کے سرمایہ دار، دونوں صرف اپنے عہد کے جذبے کا ہی عکس تھے۔ ہر سطح پر، سیاست دانوں، تاجروں، سائنس دانوں اور ماہرینِ معاشیات میں، ہندوستان کی ترقی کے لئے، ایک خود کفیل ریاست کی رہنمائی میں 'ملی جلی معیشت' کے نمونے کی حمایت میں ایک وسیع اتفاقِ رائے پایا جاتا تھا۔ یہ اتفاقِ رائے ۱۹۵۰ء کی دہائی کی ذاتی خط وکتابت، سرکاری یادداشتوں، فکری ادب اور اخباری تبصروں میں جھلکتا ہے۔[۱۲]

اگر ہندوستانی معاشی پالیسی کے ارتقا کے بارے میں روایتی سوچ تاریخی سچائی سے اس قدر مختلف ہے تو اس کے لیے سوائے مؤرخین کے کسی اور کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ یا، زیادہ خصوصیت سے، معاشی مؤرخین کو۔ یہ قاعدۃً لکشمن ریکھا کی دوسری جانب رہے، نوآبادیاتی ہندوستان کی معاشی پالیسیوں پر کئی کتابیں اور مضامین لکھے، جبکہ اپنے آپ کو، یکے بعد دیگرے آنے والی آزاد ہندوستانی حکومتوں کی معاشی پالیسیوں کی، ویسی ہی عرق ریز، جانچ سے روکے رکھا۔

مؤرخین کی ناکامی عام تصورات میں وسیع طور پر غلط ادراک کے پیدا ہونے کا سبب بنی، جیسا کہ اس مفروضے میں کہ 'نہرو معاشی زار' (Nehru the economic czar)۔ زیادہ سنجیدہ بات یہ ہے کہ، اس نے مماثل مضامین کے ساتھیوں سے بنیادی نوعیت کی غلطیاں سرزد کروائیں، جس کے لیے، پھر، وہ نہیں بلکہ مؤرخ موردِ الزام ٹھہرتا ہے۔ واقع کے طور پر، ایک اخباری مضمون جو مارچ ۲۰۰۵ء کو شائع ہوا، میں دہلی یونیورسٹی کے ایک ماہرِ سیاسیات نے دعویٰ کیا کہ 'ہندو ضابطہ بل (Hindu Code Bill)، جو ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں منظور ہوئے،

نے ہندو دیوانی (Personal) قوانین میں اصلاح نہیں کی، انہوں نے صرف ان کو منضبط کیا، یعنی، ان کو جو 'ہندوستانی سمجھی جاتی تھیں ___ شمالی ہندوستانی، اونچی ذات کی روایت ___ سے مطابق کیا۔'[۱۳] تین ماہ بعد، کسی اور اخبار میں لکھتے ہوئے، اسی یونیورسٹی کے ایک اور ماہرِ سیاسیات نے دعویٰ کیا کہ 'راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ [R.S.S] نے ہندو معاشرے کی کسی قانونی یا سماجی اصلاحات کی مخالفت نہیں کی۔ انہوں نے ان کوششوں کی حمایت میں پیش قدمی کی۔ ہندو ضابطہ بل متعارف کرانے میں مدد دینا اس قسم کی صرف ایک مثال پیش کرنا ہے۔'[۱۴]

یہ دونوں دعوے ہی جھوٹ تھے۔ ہندو دیوانی قوانین کو جدید بنانے کے لیے مرتب بی۔امبید کر نے کیا، جو مرد تو تسلیم شدہ طور پر تھے، مگر شمالی ہندوستانی نہیں تھے، اور یقیناً نہ ہی اونچی ذات کے۔ یہ اصلاحات روایتی اور راسخ العقیدہ قوانین سے کافی حد تک الگ (اور بہتر) تھیں، جس میں ہندو عورتوں کو، پہلی مرتبہ، ان کے جیون ساتھیوں کے انتخاب کی، اپنی ذات سے باہر شادی کی، اور طلاق کی اجازت دی گئی (ان اصلاحات نے ان کے شوہر اور والد کی جائیداد میں عورت کے حق کو بھی کافی بڑھایا)۔ اور بجائے ان اصلاحات کی حمایت کے، آر۔ایس۔ایس اور مماثل تنظیموں نے درحقیقت سختی سے ان کی مخالفت کی۔ جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے ممبران نے پارلیمنٹ میں ان نئے قوانین کو التوا میں ڈالنے کی کوشش کی۔ آر۔ایس۔ ایس نے سینکڑوں مظاہرے کروائے جن میں نہرو اور امبید کر سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندو روایتی قوانین میں ردوبدل کرنے کی حمایت کرنے پر وہ اپنے عہدے چھوڑ دیں۔[۱۵]

روزمرہ کی بحث میں عام لوگ ۱۹۵۰ء کی دہائی کی تاریخ سے ایک مکمل لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ کافی برا ہے۔ مگر اس لاعلمی کا مظاہرہ تربیت یافتہ اساتذہ اخبارات کی تحریروں میں کریں، یہ صرف دہلا دینے والا ہے۔ خرابی مؤرخین کی ہے۔ آزاد ہندوستان کی تشکیلی دہائیوں کی طرف سے، جب ریاست کی معاشی، خارجہ اور سماجی پالیسیوں کی صورت گری ہو رہی تھی، پیٹھ موڑ کر انہوں نے ان دہائیوں کے واقعات اور حالات کو فرد (یا محقق) کی خواہشات اور ذوق پر چھوڑ دیا کہ وہ جیسے چاہے ان کو توڑے مروڑے اور اُن کی غلط نمائندگی کرے۔

مؤرخین نے گہرائی اور بصیرت کے ساتھ کئی مشہور سماجی تحریکوں کے بارے میں لکھا جس نے برطانوی نوآبادیاتی دور کی تاریخ میں ذائقہ ڈالا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد کی ہندوستانی تاریخ کا

دور احتجاج اور جدوجہد میں کچھ کم ہی پیچھے ہے۔ چنانچہ ہمیں کسانوں اور مزدوروں کی کئی تحاریک، جو ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں اٹھیں، پر تاریخی تبصروں کا انتظار رہے گا۔ پھر، ۱۹۷۰ء کی دہائی کا وہ مشہور ابھار جس کی رہنمائی جے پرکاش نرائن نے کی تھی، اُس پر اُس دور میں لکھا گیا (اس رسالے [اکنامک اینڈ پولیٹکل ویکلی] میں بھی کچھ کم نہیں)۔ ہمیں اب اس واقعے کے درست تاریخی مطالعے کا انتظار ہے، جو حال کے جذبوں اور مناظروں سے الگ ہٹ کر، اور دستاویزات اور دیگر مواد پر مبنی ہو جو اب دستیاب ہیں۔

ادارے

ایک اور فائدہ مند تحقیقی میدان اداروں کی تاریخ بھی ہوسکتی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو [AIR] کے بارے میں سوچئے، ایک ادارہ جس نے آزادی کی ابتدائی چند دہائیوں میں تشکیلی کردار ادا کیا۔ ائیر نے علاقائی گوناگونی اور اختلافات کا احترام کرتے ہوئے قومی ثقافت کے فروغ کی کوشش کی۔ (اس کی ایک کامیابی جس کا کم اعتراف کیا گیا وہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی عظیم روایات کو مٹنے سے بچانے میں مدد ہے۔) ایک ہی وقت میں، ثقافتی کثرت کی ناگزیری، تشہیر اور پروپیگنڈا کی ناگزیری کے ساتھ بے کلی کے ساتھ موجود رہی ___ کیونکہ سیاسی معاملات میں ائیر برسرِ اقتدار جماعت کی [پالیسیوں کی] توسیع ہی بنے رہنا چاہتا تھا۔ بہرحال، ایک وسیع طور پر جاہل معاشرہ میں، وقفوں سے شائع ہونے والے پریس کے مقابلے میں، ائیر کی ایک عظیم پہنچ اور اثر تھا۔ اس ادارے کی ایک تاریخ محو کن دلچسپی کا باعث ہوگی۔ اسی طرح، ایسے دیگر اداروں کی تاریخیں ہوسکتی ہیں جن کا قوم کی زندگی پر بنیادی اثر تھا، جیسا کہ (دو نتہائی مختلف میدانوں سے مثالیں لیتے ہوئے) نیشنل ڈیری ڈویلپمنٹ بورڈ اور دہلی اسکول آف اکنامکس۔[۱۶]

جدید ہندوستان پر تاریخی ادب کی کثرت اور گوناگونی کو دیکھتے ہوئے، یہ حقیقت کہ اس کا بہت کم حصہ ۱۹۴۷ء کے دور کے بعد سے تعلق رکھتا ہے ایک تضاد، ایک معمہ اور ایک افسوس ناک بات ہے۔ دیگر اقوام اور فکری ثقافتیں زیادہ خوش قسمت رہی ہیں۔ آزاد ہندوستان میں معاشی پالیسی کی تشکیل کا کوئی قابلِ اعتماد مطالعہ موجود نہیں ہے، مگر کئی عمدہ کتابیں مابعدِ جنگ برطانیہ میں فلاحی ریاست کی تشکیل پر پائی جاتی ہیں۔ مؤرخین نے گہرائی یا بصیرت کے ساتھ آزاد ہندوستان

میں مصنفین اور ماہرینِ سماجیات کے درمیان (اکثر نہایت ذرخیز) مباحث کے بارے میں نہیں لکھا۔ جبکہ مابعدِ جنگ فرانس میں فکری زندگی پر کئی بے مثال مطالعے موجود ہیں۔ کسی بھی ہندوستانی مؤرخ نے ہماری پاکستان کے ساتھ جنگوں کے بارے میں ایک مناسب تاریخی مطالعہ تحریر نہیں کیا۔ اس کے بالکل برخلاف، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا میں مابعدِ جنگ ان کی مہم جوئی پر امریکی مؤرخین کے مطالعے اتنے زیادہ ہیں کہ جو ایک مناسب رقبے کے کتب خانے میں رکھے جاسکتے ہیں۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ اکثر غیر تحریری ہے۔ اس کے باوجود کہ، ہمیں معلوم ہے کہ یہ مابعدِ جنگ فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی تاریخوں سے زیادہ گوناگوں اور زیادہ ہیجان انگیز ہوگی۔ یہ اس لیے کہ، بحیثیت ایک ثقافت، معاشرہ، اور قوم کے ہندوستان حتمی طور پر فرانس، یا برطانیہ، یا امریکہ ___ یا سو کے قریب دیگر اقوامِ متحدہ کے ممبران میں کسی ___ سے بھی زیادہ گوناگوں اور ہیجان انگیز ہے۔

۳۔ رکاوٹیں اور مزاحمتیں

وہ مؤرخین جو ماضی قریب کے بارے میں لکھتے ہیں وہ بہت ہی مختلف (اور بعض اوقات نامعلوم) مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، ان مؤرخین کے مقابلے میں جو ماضی بعید کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ایک مسئلہ مآخذ کی دستیابی کا ہے۔ سرکاری آرکائیوز اور ذاتی دستاویزات عام طور پر تیس (۳۰) سال بعد کھلتے ہیں۔ متعلقہ ثانوی مآخذ بھی شاید کثیر تعداد میں نہ ہوں، چونکہ کلیدی تاریخی شخصیات کی یادداشتیں اور سوانح بھی ان واقعات جن کی صورت گری یا تعین کرنے میں ان کا کردار ہوتا ہے، کے کچھ سالوں یا عشروں کے بعد تحریر یا شائع کی جاتی ہیں۔

ایک دوسرا چیلنج جس کا ہم عصر مؤرخ کو سامنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جن موضوعات پر لکھ رہا ہوتا ہے، اکثر ان کے بارے میں اس کے مخاطب کے تصورات بڑے راسخ ہوتے ہیں۔ سلطنتِ وجیہ نگر کا ایک مؤرخ یا کرشن دیورائے کے سوانح نگار کو یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کے قاری موضوع کے بارے میں بہت کم جانتے ہوں گے۔ اس کی اپنی عالمانہ مہارت، اور اس کی تحقیق کی گہرائی اور نئے پن میں ایک عظیم اختیار اور قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں، مؤرخ بول یا لکھ رہا ہوتا ہے اور قاری سُن یا پڑھ رہا ہوتا ہے اور سیکھ بھی رہا ہوتا ہے۔ مگر

جدید کیرالہ کا ایک مؤرخ یا ای۔ایم۔ایس نمبودیریپد کا سوانح نگار اس قسم کی آمادہ مجہولیت [Passivity] پر انحصار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کے قاری کی پہلے ہی سے اس موضوع پر فیصلہ کن رائے موجود ہوتی ہے۔ وہ حقائق اور توجیہات جن کا جھکاؤ ان آراء سے مطابقت کی جانب ہو، کی توثیق کی جائے گی، وہ جن کا رجحان ان سے اختلاف کی جانب ہوگا ان کو خارج کردیا جائے گا۔

ہم عصر تاریخ کا قاری، قرونِ وسطیٰ یا ابتدائی جدیدیت کی تاریخ کے قاری کے برخلاف، مؤرخین پر اعتماد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ وہ متن کی طرف اپنی ذاتی، اور اکثر گہری قائم شدہ، سیاسی اور نظریاتی ترجیحات کے ساتھ آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس سے پہلے کہ مؤرخ اس کو پیش کرے قاری، 'سچ' کو جانتا ہے۔ قاری کے سچ کی بنیادیں عام طور سے سنی سنائی باتوں یا تعصّبات پر ہوتی ہیں بجائے شواہد یا تحقیق پر، اور ان ہی وجوں سے یہ پُرجوش طریقے سے ان کے اوپر چمٹا رہتا ہے، اگرچہ متبادل مؤرخ کے 'سچ' کی بنیاد پختہ تحقیقی مطالعے پر ہوسکتی ہے۔

آپ وقت میں جتنا زیادہ پیچھے جائیں، مؤرخ کو اتنا زیادہ ہی آرام میں پاتے ہیں، جتنا زیادہ اس کو اپنے مواد پر قابو ہوتا ہے، اتنا زیادہ وہ اپنے میدان میں محفوظ ہوتا ہے۔ کوئی بھی قاری مغل سلطنت کے مؤرخ کو اس، براہِ راست، جنگجویانہ انداز میں چیلنج نہیں کرے گا جیسے وہ شاید ۱۹۵۰ء کی دہائی کے مؤرخ کو کرے۔ اکبر، یا اورنگ زیب بھی، کے سوانح نگار کو ویسے ٹٹولنے والے، متشکک قاری کا سامنا نہیں ہوگا جیسا کہ نہرو یا اندرا گاندھی کے سوانح نگار کو ہوگا۔ قاری کا اپنی ذاتی آراء پر اعتماد وقت کی دوری کے حساب سے گھٹتا جاتا ہے۔ قاری جانتا ہے کہ چند ایسی چیزیں ہیں جن کو ماضی قریب کے حکمرانوں یا سیاست دانوں، مثال کے طور پر نہرو یا نمبودیریپد، کو مختلف طریقے پر کرنا چاہیے تھا۔ مگر جہاں بات سو یا دوسو سال پرانے افراد یا اداروں کی آجاتی ہے تو قاری زیادہ ہچکچاہٹ میں مبتلا ہوجاتا ہے ___ وہ اس کی خواہش تو کرسکتا ہے کہ چیزیں اس سے مختلف ہوتیں جیسی کہ وہ ہوئیں، مگر وہ اتنا پُریقین نہیں ہوتا کہ وہ ایسی ہوبھی سکتی تھیں۔

ہم عصر تاریخ کا قاری ایک ناقد قاری ہے ___ تاریخی مکالمے میں ایک متحرک شریکِ

کار۔ مگر یہ صرف قاری ہی نہیں جو تاریخی حقائق پر اپنے تعصبات کو آزماتا ہے۔ مؤرخ بھی بعض اوقات ایسا کرسکتا ہے۔ یہ، پھر، ہم عصر تاریخ کا تیسرا چیلنج ہوا، یعنی کہ، ماضی قریب کی تاریخ کے مؤرخ کی اپنے موضوع سے متعلق سخت اور پہلے سے قائم شدہ آرا ہوسکتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ آرکائیوز میں داخل ہو وہ پہلے سے جانتا ہو کہ اسے کس قسم کے نتائج کی تلاش ہے۔ وہ ثبوت جو ان کی سوچ کی سمت جاتے ہوں، کو اشتیاق کے ساتھ پکڑ لیا جائے گا - وہ ثبوت جو اس کا رد کرتے ہوں، کو اہمیت نہیں دی جائے گی۔ جدید کیرالہ کے مؤرخ کے لئے یہ آسان نہیں کہ وہ کمیونسٹ اور کانگریس کے موجودہ وقت کے مناظروں سے اپنے آپ کو مکمل طور پر الگ کھڑا کرسکے۔ دوسری جانب، اس بات کا کم امکان ہے کہ وجیہ نگر سلطنت کا مؤرخ اپنی عالمانہ تحقیق پر اپنی سیاسی ترجیحات کو آزمائے گا۔

ہم عصر تاریخ کی تحریر اور قبولیت دونوں جذبات اور تعصّبات سے دوچار ہیں۔ کیونکہ جس جہان میں مؤرخ اور اس کا قاری رہتا ہے اور حصہ بانٹتا ہے اس کی صورت گری میں ماضی قریب کی شخصیات اور پالیسیوں کا گہرا ہاتھ ہے۔ ای۔ ایم۔ ایس نمبودیریپد اور اس کی جماعت کے نقوش کیرالہ پر بھاری طور پر منڈلا رہے ہیں، ویسے ہی جیسے کہ جواہر لال نہرو اور اس کی جماعت کے نقوش جدید ہندوستان پر۔ ہر غور وفکر کرنے والے ملیالی کی ای۔ ایم۔ ایس اور اشتراکیت کے بارے میں ایک رائے ہے، ہر سوچ بچار کرنے والے ہندوستانی کی نہرو اور کانگریس کے بارے میں ایک رائے ہے۔ دوسری جانب، زیادہ دور کے وقت کے حکمرانوں اور سیاسی اداروں کے نقوش کی شناخت زیادہ آسان نہیں ہے۔

چنانچہ، قاری اور مؤرخ دونوں کے لئے، آپ وقت میں جتنا پیچھے جائیں، یہ زیادہ آسان ہوجاتا ہے کہ آپ سیاسی نزاع اور بحث کے غوغا اور ہنگامے سے الگ کھڑے ہوں۔ آپ پیچھے کی جانب جتنا دور جائیں قاری اتنا ہی زیادہ مؤرخ کا احترام کرنے اور اس سے سیکھنے پر آمادہ ہوگا۔ آپ جتنا پیچھے کی جانب دور جائیں اتنا اس بات کا کم امکان رہ جاتا ہے کہ مؤرخ اپنے ذاتی یا نظریاتی ایجنڈے کو اپنی تحقیق پر آزمائے گا۔[۱۷]

یہ تین چیلنجز ___ جیسا کہ، مآخذ کی جڑوں کا کمزور ہونا، کہ قاری کا متن کا ناقد قاری ہونا، اور یہ کہ مؤرخ کے اپنے تعصب اور جانبداری کے قوی امکانات کا ہونا ___ ہم عصر مؤرخین میں

ہر جگہ عام ہیں۔ مگر ہندوستان میں یہ قوت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہاں، ماخذ کئی دیگر ممالک کے مقابلے میں زیادہ کم ہیں۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ 'ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے'، جو کہ چند معنوں میں (جیسا مثال کے طور پر رائے دہندہ کی تعداد کے حساب سے) یقینی طور پر ہے بھی۔ مگر سرکاری ریکارڈز کے معاملے میں ہندوستانی سرکار جمہوری نہیں ہے۔ دیگر پختہ جمہوریتیں واقعے کے تیس سال بعد محققین کے لیے سرکاری دستاویزات دستیاب کر دیتی ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسرائیل جیسا ملک، جس کے اپنے پڑوسیوں سے مسلسل اور تلخ اختلافات ہیں، تیس سال کے قانون پر پابندی سے قائم ہے، یہاں تک کہ سرحدوں اور اقتدارِ اعلیٰ سے متعلق سوالات پر بھی۔ مگر مخصوص طور پر اسی ہندوستانی خوف اور لاپرواہی کے ملاپ کی وجہ سے، ۱۹۴۷ء اور بعد کے بہت کم تعداد ہندوستانی سرکاری ریکارڈز کو قومی آرکائیوز میں منتقل کیا گیا۔ اور وہ مواد جو آرکائیوز تک پہنچے وہ خاص دلچسپ اور اہم نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر، ۱۹۴۷ء سے ہماری معاشی، خارجہ، اور لسانی پالیسیوں کی تشکیل کرنے سے متعلق ریکارڈز ابھی تک ہمارے محققین کی پہنچ میں نہیں ہیں۔

'عوامی' اور 'نجی'

تاریخی تحقیق میں رکاوٹ وہ مبہم سرحدیں ہیں جو ہندوستان میں 'عوامی' اور 'نجی' کے درمیان موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم، جواہر لال نہرو، کے سرکاری دستاویزات ان کے وارثوں کے قبضے میں ہیں۔ صرف دو غیر ملکی محققین اور دو ہندوستانیوں کو ان اسے استفادہ کی اجازت ملی ہے۔ اندرا گاندھی کے بحیثیت وزیرِ اعظم سرکاری خط و کتابت کو خاندان سے باہر کسی کو بھی نہیں دکھایا گیا۔ یہ کہ یہ 'سرکاری' دستاویزات محققین کو میسر نہیں شاید غیر قانونی ہے۔ مگر یہ کہ ان کا بند رہنا یقیناً ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء کے درمیان ہندوستانی سرکار کی پالیسیوں کی گہری سمجھ حاصل کرنے میں رکاوٹ ہے۔

نہرو- گاندھی خاندان کے باہر بھی، مؤثر افراد کی نجی اور سرکاری دستاویزات اتنی تعداد میں اور اس قدر دستیاب نہیں جس کی آپ خواہش کریں کہ انہیں شاید ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہندوستانی عام طور پر ریکارڈز اور تاریخی ثبوتوں کی جانب لاتعلق ہیں - چنانچہ، جب کسی خاص

ہندوستانی کی وفات ہوتی ہے، اس کے ریکارڈز کو اکثر جلا دیا یا 'ردی' کے طور پر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ دوسری جانب، ان کی یا تو تقریباً مالیخولیائی حد تک چوکنے انداز میں حفاظت کی جاتی ہے، یا مقدس قرار دیکر محققین سے دور رکھا جاتا ہے (پہلی صورتحال اکثر مصنفین اور سماجی کارکن کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعد کی صورتحال سیاستدانوں یا شعلہ بیان خطیبوں کے حوالے سے ہے)۔

علمی نوعیت کی مجبوریاں اور دباؤ بھی ہم عصر تاریخ میں رکاوٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، ہندوستانی تاریخ نویسی کے لئے ایجنڈا، اُصولی طور پر، مابعدِ جدیدیت اور مابعدِ ساختیات [Post-Structuralism] کی لہروں نے مقرر کرلیا ہے۔ یہ رجحانات آرکائیوز میں ہونیوالی تحقیق کو کم مراعات یافتہ بنانے کی طرف مائل ہیں ۔ ان کے پاس سیاسی تاریخ کے لئے کم وقت ہے ۔ اور وہ عملی طور پر سوانح کے مخالف ہیں۔ آخراً، ان طریقوں اور رجحانات پر یورپی نوآبادیاتی نظام کے اثرات کا تسلط غالب ہے۔

وہ جو علمی طریقوں کے مطیع ہیں وہ ہماری تاریخی سمجھ کی اس خلیج کو، جس کی نشاندہی اس مضمون میں کی گئی ہے، پُر کرنے کے لئے شاید آسانی سے آمادہ نہ کئے جاسکیں۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی کے بنگال پر لکھنے کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو ان عظیم اور بظاہر عالمی موضوعات سے جوڑنا جیسا کہ 'نوآبادیات' اور 'جدیدیت' - ۱۹۵۰ء کی دہائی کے مغربی بنگال کے بارے میں لکھنا، جب سارے سفید فام رخصت ہو چکے تھے اور یہ تقسیم شدہ صوبہ ہندوستانی ریاست کا صرف ایک حصہ تھا، اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالنا ہوگا کہ آپ، کم از کم اپنے استادوں کے سامنے، 'صوبائی' دکھائی دیں۔ یہ بھی شاید ایک وجہ ہو تاریخ نویسی کے اس قدر غیر متوازن حد تک ۲۰ ویں صدی کے پہلے نصف کی طرف زیادہ مائل ہونے کی - آخر کیوں ۱۹۵۰ء کی دہائی پر لکھے گئے ہر مضمون یا کتاب کے مقابلے پر شاید سو مضامین اور کتابیں ۱۹۲۰ء کی دہائی کے بنگال پر لکھے گئے ہیں۔

۴۔ اور ان پر کیسے قابو پایا جائے

گذشتہ حصے میں ہم عصر ہندوستانی مؤرخ کے سامنے کھڑی ہوئی رکاوٹوں پر زور دیا گیا۔ یہ اختتامی حصہ میرے ساتھیوں کو ایک سنجیدہ نصیحت ہے کہ وہ ان کو یا تو نظر انداز کر دیں یا ان پر قابو پائیں۔

آغاز میں [یہ کہ]، ہم عصر تاریخ کے مآخذ شاید اس سے زیادہ وافر ہیں جتنا کہ اکثر

ہندوستانی مؤرخین سمجھتے ہیں۔ سچ ہے کہ نئی دہلی میں قومی آرکائیو، اور لندن کی برٹش لائبریری کا انڈین آفس کلکشن، زیادہ تر نوآبادیاتی دور کے ریکارڈز سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر نئی دہلی میں نہرو یادگاری عجائب گھر اور لائبریری نے بڑی محنت سے ذاتی اور ادارہ جاتی دستاویزات کا ایک شاندار ذخیرہ تعمیر کیا ہے۔ نہرو لائبریری سے ۲۰۰۳ء میں شائع شدہ ایک دستی کتاب میں چھ سو اکیاسی (۶۸۱) الگ ذخائر کی ایک فہرست شامل کی گئی ہے۔ ان میں بڑی سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ مؤثر اور اہم مصنفین، سائنس دانوں، نوکر شاہی، سفراء، اور سب سے بڑھ کر، تمام مختلف زاویۂ فکر رکھنے والے سیاست دانوں کی دستاویزات شامل ہیں۔ ۱۸ بعض ریاستی آرکائیوز نے بھی ان ہندوستانیوں کی دستاویزات ذخیرہ کی ہیں جنہوں نے آزادی کے بعد زندگی برتی اور کام کیا۔

ان ذخائر سے، اگر آپ انتخاب کریں تو، آزاد ہندوستان کی سیاسی اور ادارہ جاتی تاریخ کی کئی پہلوؤں سے تشکیلِ نو کر سکتے ہیں۔ حقیقتاً، این۔ایم۔ایل (نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری) کے مسودوں کے گوشے میں موجود مواد میری کتاب 'گاندھی کے بعد کا ہندوستان' کے لیے ناگزیر ثابت ہوا۔ بہرحال، اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد، این۔ایم۔ایم۔ایل کی نئی انتظامیہ نے مابعد ۱۹۴۷ء کے عہد کے مواد کی دستیابی پر سخت پابندی عائد کر دی۔ پہلے کے وقتوں میں، خاص طور پر عظیم روندر کمار کی مہتمم داری کے تحت، این۔ایم۔ایم۔ایل کے منتظمین نے محققین کو تیس سال سے زیادہ پرانے اپنے تمام ذخائر تک رسائی کی اجازت دی۔ اب، بہرحال، اپنے سیاسی آقاؤں کو ناراض کرنے کے خوف نے این۔ایم۔ایم۔ایل کی انتظامیہ کو مجبور کیا ہے کہ وہ کشمیر، چین، ایمرجنسی، اور دیگر ایسے معاملات کی دستاویزات، جو نزاع انگیز اور متنازع ہو سکتے ہیں، تک پہنچ کو محدود کر دیں۔ پھر سے، ممکن ہے کہ یہ پالیسی غیر قانونی ہو، کیونکہ ذاتی دستاویزات کے ذخائر کی مالی معاونت کرنے والوں نے اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس تنگ نظر (اور عقل مخالف) پالیسی کو بدل دیا جائے گا، اور ایک بار پھر محققین کو این۔ایم۔ایم۔ایل کے ذخائر کے ان ریکارڈز تک بے قید رسائی کی اجازت ہوگی۔

ہم عصر تاریخ کے لیے سرکاری ریکارڈز اور ذاتی دستاویزات دو بنیادی ذخائر ہیں۔ ایک

تیسرا، اور اتنا ہی اہم، ہندوستان میں وقفوں سے شائع شدہ پریس کا ناقابلِ یقین زرخیز ذخیرہ ہے۔ این۔ایم۔ایل ہی میں انگریزی، تامل، ہندی، بنگالی اور دیگر زبانوں کے روز شائع ہونے والے اخبارات کا شاندار خزانہ مائیکروفلم پر موجود ہے؛ اور ساتھ ہی لاتعداد اہم ہفتہ وار بھی۔ ملک کے دیگر حصوں میں اخبارات اور رسائل کے دفاتر نے بھی اپنی فائلیں مرتب کی ہوئی ہیں۔ وقت کے سماجی اور سیاسی دھاروں کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے اور اُن کی نمائندگی کرتے ہوئے، قومی اور آزاد ہندوستانی پریس مؤرخین کے لیے ایک شاندار ذخیرہ ہے، اگرچہ ان [مؤرخین] کی جانب سے کم استعمال شدہ۔[19]

ایک چوتھا مآخذ، یقیناً، زبانی تاریخ ہے۔ یہاں ہم عصر مؤرخ کو اپنے قدامت پسند [پیچھے دیکھنے والے] ساتھیوں پر ایک فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے بنگالی مصلح راجہ رام موہن رائے کے سوانح نگار کو اپنے موضوع سے متعلق معلومات صرف تیسرے، چوتھے ہاتھ سے حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر بیسویں صدی کے بنگالی سیاست دان بی۔سی۔رائے کا سوانح نگار، حقیقت میں جسمانی طور پر، کئی ایسے افراد سے مل سکتا ہے جو اس کے موضوع کو کبھی انتہائی قریب سے جانتے تھے۔ یہی سماجی تاریخ کے لیے بھی درست ہوگا - مثال کے طور پر، اطراف میں کئی ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے ہندوستانی ریلوے کے ملازمین کی ۱۹۷۴ء کی ہڑتال میں حصہ لیا ہو، جب کہ ۱۸۵۵ء کی سنتھل [Santhal] 'حول' [hool] کے باغیوں کی وفات کو ایک صدی اور اس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ مؤرخین کے لئے غیر دانشمندانہ ہوگا کہ وہ مکمل طور پر زبانی گواہوں پر انحصار کریں۔ بہرحال، جب ہم عصر دستاویزات ___ چاہے ذاتی خطوط یا یادداشتیں یا اخباری رپورٹ ___ کے ساتھ اور بحیثیت ان کی تکمیل کے سمجھداری سے استعمال کیا جائے، تو یہ [زبانی گواہ] ماضی قریب کی توجیہِ نو کے لیے کافی فائدہ مند ثابت ہوسکتے ہیں۔[20]

ایک پانچواں مآخذ ان ممالک کی سرکاری دستاویزات پر مشتمل ہے جن کا ہندوستان سے قریبی (یا نزاعی) رشتہ رہا ہو۔ چنانچہ، نئی دہلی میں امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس (دیگر کے علاوہ) کے سفارت خانوں نے ہندوستان کی سرگرمیوں پر، ہندوستان کے مختلف حصوں میں تمام سماجی حلقوں کے لوگوں سے ملاقاتوں کے ذریعے، گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ ان کی معلوماتِ

تحقیق تفصیل کے ساتھ اپنے ممالک کو ارسال کی گئی ہیں۔ یہ خطوط اور دستاویزات ان ممالک کے قومی آرکائیوز میں اب دستیاب ہیں۔ ان میں عملی طور پر ہندوستانی سیاست اور معیشت کے تمام پہلوؤں پر قیمتی معلومات شامل ہیں۔

اس کے برعکس جو اکثر سمجھا جاتا ہے (یا جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے)، ہندوستان میں ہم عصر تاریخ نگاری کے لیے مآخذ موجود ہیں۔ ان مآخذ میں تحقیق ایک محنت طلب کام ہوگا ۔ ان کی مدد سے کچھ لکھنا شاید اس سے بھی زیادہ مشکل۔ کیونکہ ماضی قریب کے مؤرخ کو حال کے تعصبات میں سے راستہ نکالنا پڑے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستانی تاریخ سب سے زیادہ نزاع انگیز میدان ہے۔ ہمارے قومی ورثے پر جنگیں حقیقتاً انتہائی تلخ ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو گاندھی اور کانگریس کو حقیقی طور پر ہندوستان کو آزادی دلانے والے سمجھتے ہیں، اور ہوں گے جو سوارکر اور ہندو توا کو یہ خطاب پیش کریں گے، اور بھی ہوں گے جو بھگت سنگھ اور انقلابی اشتراکیت کو، جبکہ کچھ ایسے بھی ہوں گے جو سبھاش چندر بوس اور ہندوستانی قومی فوج کو یہ خطاب دینا چاہیں گے۔

پُرخطر راہ

ہندوستانی قوم پرستی کے مؤرخ کو ان ایک دوسرے سے برسرِ پیکار توجیہات اور دعوؤں کے درمیان سلسلۂ جنبانی کا پرخطر راستہ وضع کرنا پڑتا ہے۔ کون یہ کہہ سکتا ہے کہ آزاد ہندوستان کے مؤرخ کا کام کوئی آسان کام ہوگا؟ اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہ کہ، شاید یہ زیادہ ہی مشکل ہو۔ جواہر لال نہرو کے پیدا کئے ہوئے جوشِ جذبات مہاتما گاندھی کے پیدا کیے ہوئے جوشِ جذبات سے کہیں زیادہ ہیں۔ بلکہ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ہندوستانی تاریخ کے عہد کے غیر جذباتی تجزیے کو فرقہ وارانہ شناختیں، جن کی بنیادیں ذات پات اور مذہب پر ہیں، خاموش یا خوفزدہ کردیں۔

اس بات کا اندیشہ ہے کہ ماضی قریب کے بارے میں کوئی بھی چیز جو مؤرخ کہے یا لکھے گا وہ سیاست کا شکار ہوجائے گی۔ لیکن مؤرخ کے لیے اپنی ذمہ داری سے کوئی مفر نہیں، اور کچھ نہیں تو اپنی علمی ذمہ داری، اپنی پیشہ وارانہ پکار کی وجہ سے ہی۔ بہرحال، ایک مربوط، معقول، آزاد طریقے سے ہم عصر تاریخ تحریر کرنے کے لیے مؤرخ کو چاہیے کہ وہ اپنے مآخذ کی طرف

ایک مکمل آزاد ذہن کے ساتھ رجوع کرے۔ وہ مکمل طور پر اپنے عقائد اور تعصّبات کو نہیں چھوڑ سکتا ۔ مگر کم از کم وہ یہ کوشش کرسکتا ہے کہ ان کو ایک طرف رکھ دے۔

کتنے بہتر طریقے سے مؤرخ ہم عصر تاریخ کے چیلنج کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ کتنے عمدہ طریقے سے وہ اپنے آپ کو موجودہ وقت کے استدلال اور دشمنیوں سے، جس کا وہ بھی اپنے قاری کی طرح شکار ہے، بلند کرسکتا ہے ؟ دو حکمتِ عملیاں شاید یہاں کارآمد ثابت ہوں۔ پہلی ایف۔ڈبلیو۔مایٹ لینڈ (F.W. Maitland) کی جانب سے ہے کہ 'جو ابھی ماضی میں ہے وہ کبھی مستقبل میں تھا'۔ دوسری جارج آورویل (George Orwell) کی جانب سے ہے کہ 'مصنف کو کبھی بھی کسی سیاسی جماعت کا وفادار رکن نہیں ہونا چاہیئے'۔ مایٹ لینڈ کی حکمت عملی بادئی النظر کی مراعات کو استعمال کرنے کے خلاف خبردار کرتی ہے۔ آورویل کی حکمت عملی ہمیں آج کی سیاسی ترجیحات کو ہمارے ماضی کے بیان پر مسلط کرنے کے خلاف خبردار کرتی ہے۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ مؤرخ کو ماضی کے بارے میں غیر جذباتی اور سنجیدہ ہوکر لکھنے کے لیے ایک نسل کی دوری کی ضرورت ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ۱۹۵۰ء کی دہائی کو 'تاریخ' کے طور پر نہیں برتا جاسکتا تھا ۔ مگر اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اس کو لازمی طور پر برتا جاسکتا ہے۔ جب پچیس یا تیس سال گزر جائیں، تو آپ حالات وواقعات کو اُس جانبدارانہ جذباتیت سے الگ ہوکر دیکھ سکتے ہیں جو انہوں نے اس وقت میں پیدا کی۔ موجودہ اور گذشتہ عشرے کے واقعات حالاتِ حاضرہ کا مواد ہیں۔ مؤرخ کا کام نہیں کہ وہ ان پر فیصلے جاری کرے۔ مثال کے طور پر، آپ کو ابھی تک نہیں معلوم کہ آیا آزاد معیشت فیصلہ کن طور پر جنوبی ایشیا کے لوگوں کے مرضِ غربت کا خاتمہ کردے گی۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ آیا ہندوتوا کی لہر اپنی انتہا کو پہنچ چکی، اور [اب] گزر جائے گی۔

دوسری جانب، آزاد ہندوستان کے بشمول ایمرجنسی تک کے عہد کا صحیح معنوں میں تاریخی عینک کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں زندگی بتاتے ہوئے اندرا گاندھی اور جے پرکاش نرائن کے درمیان مخالفت میں فریق نہ بننا مشکل ہوتا، ایک (دونوں میں سے کوئی بھی) بحیثیت محافظ اور آزادی دلانے والا اور دوسرا بحیثیت تباہ کرنے والا۔ اب، کئی عشروں بعد، کئی نئے مآخذ کی دستیابی کے ساتھ، اور اس دوری کے ساتھ جو وقت کے ساتھ آتی ہے، آپ

کسی پہلو پر لکھی جائے، جب آپ پہلی کتاب آزادی کے بعد کے بنگال کی سماجی تاریخ کے پورے (یا کم از کم اکثر) پہلوؤں پر لکھ سکتے ہیں؟ کیوں بنکیم چندر چٹرجی پر بیسویں یا تیسویں کتاب لکھی جائے، جب آپ ماسویتا دیوی پر پہلی سوانح لکھ سکتے ہوں؟

حوالہ جات

۱۔ اس مضمون میں میں نے 'سماجیات' کو 'سماجیات اور سماجی بشریات' (Social Anthropology) کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

۲۔ اس لکشمن ریکھا کو ہندوستان پر لکھنے والے غیر ملکی مفکرین نے بھی بڑی احتیاط کے ساتھ نبھایا ہے - مؤرخین کا تعلق نوآبادیات اور اس سے پہلے کے دور سے، ماہرینِ سیاسیات اور ماہرینِ سماجیات کا تعلق آزادی اور اس کے بعد کے دور سے۔

۳۔ ان کاموں کا حوالہ اس مضمون میں ان کے مناسب مقامات پر دیا گیا ہے۔
میں یہاں صرف انگریزی کتب کی بات کر رہا ہوں — جیسا کہ ہوتا ہے، وہ مفکرین جو مراٹھی میں لکھ رہے تھے انہوں نے، ہم عصر تاریخ پر اہم کام لکھے، یعنی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے مہاراشٹر کے سماج اور سیاست پر۔ خاص طور پر ان مفکرین نے — ان میں دھنانجے کیر (Dhananjay Keer)، کمار کیتکر، اور وائی۔ ڈی۔ فاڈ کے (Y.D. Phadkey) — زیادہ تر اکادمی کے باہر رہ کر کام کیا۔

۴۔ سیکھر بندوپدھیائے [Sekhar Bandopadhyay]، پلاسی سے پارٹیشن تک [*From Plasey to Partition*]، (حیدرآباد: اورینٹ لانگ مین، ۲۰۰۴ء)۔ بندوپدھیائے کی کتاب میں ایک شاندار فہرستِ کتب ہے، جس میں نوآبادیاتی عہد کے ہندوستان کے مختلف پہلوؤں پر اہم کتب اور مضامین شامل ہیں۔

۵۔ ایک طویل عرصے تک ماقبلِ نوآبادیات کی تاریخ سے مراد مغل سلطنت کی تاریخ تھی، اور اس سلطنت کی مارکسی توجیہہ لیے ہوئے۔ چونکہ اپنی انتہائی توسیع کے دور میں بھی

مغلوں کا تسلط موجودہ ہندوستان کے صرف چالیس فیصد حصے پر تھا، اور چونکہ مارکسیت کا تعلق کئی میں سے صرف ایک تاریخی رجحان سے ہے، یہ غالب نظری سانچا (Paradigm) دہری حد بندیوں کا شکار تھا۔ مفکرین کی ایک نئی نسل اب جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان (تمام علاقے جن کو مغلوں نے بمشکل چھوا تھا) پر توجہ مرکوز کر رہی ہے، اور بڑے حساس انداز میں سماجی، ثقافتی، ماحولیاتی اور جمالیاتی معاملات پر لکھ رہی ہے، جس کا راسخ العقیدہ مارکسیت کی معاشی پختہ ارادی صحیح طرح ادراک کرنے سے قاصر تھی۔ اس نئی ماقبلِ نوآبادیات تاریخ کے داعیوں میں مظفر عالم، رچرڈ ایٹن، سُمیت گوھا، شیلڈن پولک، ڈیوڈ شالمن، سنجے سبرھامینم، سنتھیا ٹلبت، اور فلپ ویگنر شامل ہیں۔

6. John Goldthorpe, 'The Uses of History in Sociology', *British Journal of Sociology*, Volume 42, Number 2, 1991.

۷۔ میرے روایتی 'وہ' (he) کا استعمال، جو مرد اور عورت دونوں کو ظاہر کرتا ہے، کو میرے مردوں کی جانب تعصب کے طور پر نہیں لیا جانا چاہیے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ مجھے متبادل 'she' یا 'he or she' بھدا اور بوجھل لگتا ہے۔

۸۔ ہندوستان میں حقیقی 'تقسیم کی صنعت' (Partition Industry) ہے، جس کا موازنہ اسرائیل کی 'قتلِ عام کی صنعت' (Holocaust Industry) سے کیا جاسکتا ہے۔ تقسیم کی ۶۰ ویں سالگرہ نے اس موضوع پر کتابوں کے نئے سرے سے عود کر آنے میں ایک تحریک کا کام کیا ہے۔ جیسا کہ 'قتلِ عام' (Holocaust) کے ساتھ ہوا، مؤرخین اور مصنفین نے اس سنجیدگی سے ــــ ہم ایک بار پھر یہ ہمت نہیں کر سکتے کہ کہیں کہ 'لگاؤ کی حد تک' ــــ اس پُرآشوب واقعے پر توجہ مرکوز کی کہ انہوں نے بعد کی نسلوں اور عشروں پر اس کے اثرات کو یا تو نظر انداز کیا یا اس کی اہمیت کو کم کیا۔
تقسیم کی باقیات، آزاد ہندوستان کی معاشی اور سماجی تاریخ پر اس کے اثرات، کو صرف حال ہی میں، اور بڑی دیر کے بعد، مفکرین کی جانب سے توجہ حاصل ہونا شروع ہوئی۔

مثال کے طور پر دیکھئے:

Tai Young Tan and Gyanesh Kudesia, *The Aftermath of Partition in South Asia*, Routledge, London: 2000; Gyanesh Kudesia, 'The Demographic Upheaval of Partition: Refugees and Agricultural Resettlement in India, 1947-67', *South Asia*, Volume 18, Number 1, 1995; Joya Chatterji, 'Right or Charity? The Debate over Relief and Rehabilitation in West Bengal, 1947-50' in Suvir Kaul (ed), *The Partitions of Memory: the Afterlife of the Division of India* (Permanent Black, Delhi: 2001); Ravinder Kaur, *Since 1947: Partition Narratives among Punjabi Migrants in Delhi*, Oxford University Press, New Delhi: 2007; and, perhaps above all, Prafulla Chakravarti, *The Marginal Men: The Refugees and the Left Political Syndrome in West Bengal* (Naya Udyog, Calcutta: 1999). (The original, Bengali, edition of Chakravarti's book came out several years before its English translation.)

عدم توازن محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خود تقسیم پر ہی سینکڑوں کتابیں اور مضامین ہیں، اور اس کے اتنے ہی دلچسپ (اور اہم) اثرات پر صرف گنتی کی چند۔

9. See Sarvepalli Gopal, *Jawaharlal Nehru: A Biography*, three volumes (London: Jonathan Cape, 1976-84); Rajmohan Gandhi, *Patel: A life* (Ahmedabad: Navjivan Press, 1991); idem, *The*

Rajaji Story, New Delhi: Penguin India, 1995. Cf also Sarvepalli Gopal's *Radhakrishnan: A Biography* (New Delhi: Oxford University Press, 1989).

10. Katherine Frank, *Indira: The Life of Indira Nehru Gandhi*, London: Harper Collins, 2001; Inder Malhotra, *Indira Gandhi*, New Delhi: National Book Trust, 2006; Ajit Bhattacharjea, *Unfinished Revolution: A Political Biography of Jayaprakash Narayan* (Delhi: Rupa and Co, 2004).

۱۱۔ ہمیں اپنے آپ کو سیاست دانوں اور مصنفین تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ ہندوستانی سوانحی روایت کی غربت کا مظاہرہ اس حقیقت میں بھی ہوتا ہے کہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی شہرت یافتہ موسیقاروں کی بھی کوئی سوانح نہیں ہے، جیسا کہ روی شنکر، یا پھر ایک منتظم (entrepreneur) کی، جس نے، چاہے اچھے یا برے، ہماری سیاسی معیشت (political economy) کی قطعاً تشکیلِ نو کی — مثال کے طور پر، دھیرو بھائی انبانی۔

جب کہ انبانی کی ایک سوانح عمری کا انتظار ہے، ہمارے پاس پچھلی نسل کے سیاست میں ذکی تاجر، جی۔ڈی۔ برلا پر ایک قیمتی مطالعہ موجود ہے۔ دیکھئے:

Medha M Kudaisya, *The Life and Times of G D Birla* (New Delhi: Oxford University Press, 2003).

12. See Ramachandra Guha, *India after Gandhi: The History of the World's Largest Democracy* (London: Macmillan, 2007), Chapter 10.

13. Nivedita Menon, 'A Debate Among Men', *The Telegraph*, March 23, 2005.

14. Rakesh Sinha, 'Nasty, Brutish and Shorts', *The Hindustan Times*, July 23, 2005.

۱۵۔ ان مباحث، جیسے یہ اُس وقت وجود پذیر ہوئے، کا ذائقہ چکھنے کے لیے دیکھئے گوھا کی کتاب 'ہندوستان مابعدِ گاندھی' (*India after Gandhi*)۔ زیادہ جامع اور مستند بیان کے لیے دیکھئے چترا سنہا (Chitra Sinha) کی آئندہ آنے والی کتاب، 'ہندو ضابطہ بل اور جدید ہندوستان کی صورت گری'، (*Hindu Code Bill and the Shaping of Modern India*).

۱۶۔ بہرحال، جلد ہی ہمارے پاس ایک اہم سائنسی ادارے کا مطالعہ موجود ہوگا—ٹاٹا انسٹیٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ، جس کی تاریخ اندرا چودھری تحریر کر رہی ہیں۔

۱۷۔ یقیناً، اس اصول سے مستثنا مثالیں بھی ہیں، جیسا کہ ایودھیا کے تنازع میں، جہاں ۱۹۸۰ء کی دھائی کے ایک سیاسی اور مذہبی نزاع نے ہندوستانیوں کی ۱۵۲۰ء کی دھائی میں وقوع پذیر ہونے—یا نہ ہونے— والے واقعات کے فہم—یا غلط فہمی—پر اثر مرتب کیا۔

18. *NMML Manuscripts: An Introduction*, Nehru Memorial Museum and Library, New Delhi: 2003.

۱۹۔ ہم عصر تاریخ کے وہ تین کام جس میں اخباری رپورٹروں سے اچھا خاصہ فائدہ اٹھایا گیا وہ ہیں:

Sisir Kumar Gupta, *Kashmir: A Study in India-Pakistan Relations*, Bombay: Asia Publishing House, 1966; George Perkovich, *India's Nuclear Bomb: The Impact on Global Proliferation*, Berkeley: University of California Press, 1999; Prafulla Chakravarti, *The Marginal Men*.

۲۰۔ گران ول آسٹن (Granville Austin) کا کام ذاتی دستاویزات، سرکاری

دستاویزات، اخباری رپورٹوں، اور زبانی تاریخوں کے بیک وقت ماہرانہ استعمال کی ایک اچھی مثال ہے۔ دیکھئے ان کا کام:

The Indian Constitution: Cornerstone of a Nation (Oxford: Oxford University Press, 1966); and its sequel, *Working a Democratic Constitution: The Indian Experience* (New Delhi: Oxford University Press, 1999).

۲۱۔ مجھے یاد ہے وکرم سیٹھ کے ساتھ ایک انٹرویو جو میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا۔ اس وقت سیٹھ نے ایک نیا ناول شائع کیا تھا، جس کا موضوع موسیقی پر تھا۔ انٹرویو لینے والا اس حیرت انگیز اتفاق پر رائے دے رہا تھا کہ ہندوستانی الاصل دو مصنفین — سلمان رشدی دوسرے — نے، ایک ہی سال میں، موسیقی سے متاثر ناول شائع کیے۔ سیٹھ نے اس کو ذرا دوسرے زاویے سے دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ناروے کے دو مصنفین بیک وقت پنسل پر کتابیں شائع کریں تو اب یہ ایک حیرت کی بات ہوگی۔ مگر موسیقی ایک وسیع اور کشادہ، تقریباً آفاقی، مضمون تھا، جیسا کہ ہندوستان بھی۔ کیوں اس حقیقت کو کہ دو ہندوستانی مصنفین نے موسیقی پر کتابیں شائع کیں بحیثیت اتفاق کے دیکھا جائے؟ اس حقیقت کو کہ ہندوستان دنیا کا دلچسپ ترین ملک ہے ناول نگاروں، ڈرامہ کاروں، فنکاروں اور فلم کاروں، اس کا مطلب ہے کہ وہ جن کا تعلق لفظوں اور تخیلات کے ساتھ اور نمائندگی کے ساتھ ہے، نے سمجھ بھی لیا اور اس پر کام کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ مؤرخین کے برخلاف، ہم عصر ہندوستان میں بسنے یا کام کرنے والا تخلیقی فنکار اس مراعت سے استہزا یا پرہیز نہیں کرتا — وہ اس کو پکڑ لیتا ہے، دونوں ہاتھوں سے۔

استدلال اور تاریخ

عرفان حبیب
ترجمہ: ہما غفار

ڈاکٹر ذاکر حسین کے تحت علی گڑھ یونیورسٹی سے میں نے اپنی پہلی ملازمت کا پروانہ حاصل کیا، لیکن یہ ایک ذاتی معاملہ ہے جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی آزاد اور سیکولر جدید انڈیا سے وابستگی ہے جس سے وہ اپنی پوری زندگی جڑے رہے۔ وہ مقصد جس کے لیے انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل (MAO) کالج چھوڑا، جو کہ اس وقت یونیورسٹی بننے جا رہا تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں مدد دی، ترک موالات کی تحریک کے قومی تعلیمی پروگرام کے تحت۔ ذاکر حسین نے بحیثیت وارد ھا اسکیم کے لکھنے والوں میں سے چاہا کہ تعلیم کو عام لوگوں تک پہنچائیں اور اپنی تمام زندگی ایک سیکولر، روشن اور منصفانہ معاشرے کے لیے عوام کی تمناؤں کو اظہار کی زبان دی۔

اس عظیم شخصیت کے اس مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس سے یہ لیکچر منسوب ہے، میں سمجھتا ہوں میرے لیے اچھا ہوگا کہ میں استدلال اور تاریخ پر کچھ کہوں میں ابتدا ہی میں یہ وضاحت کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں میرے ذہن میں بنیادی طور پر انڈیا کی تاریخ ہے میں

زیرِ نظر مضمون معروف تاریخ داں پروفیسر عرفان حبیب نے ۲۸ فروری ۱۹۹۴ء کو چھٹے ذاکر حسین میموریل لیکچر کے طور پر پیش کیا۔ لیکچر کا عنوان Reason and History تھا جس کو بعد ازاں اسی سلسلے کے دیگر لیکچروں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ یہاں اسی لیکچر کا ترجمہ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے (ادارہ)۔

نے اس موضوع کا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ مجھے یہ لگتا ہے کہ انڈیا میں تاریخ نویسی کی تمام جدید روایات، خصوصیت سے وہ روایت جو قومی دبستان کے مؤرّخین نے اس مطمحِ نظر کے ساتھ منظّم کی کہ انڈیا کی تاریخ کے مطالعے کو عقلیت، سائنسی رجحانات پر قائم کیا جائے، اس ملک میں اب اس پر سوال اٹھ رہے ہیں، لہٰذا بحیثیت مؤرّخ اپنے پیشے کے لیے جو بہتر کرسکتا ہوں وہ ان اہم نکات پر بحث جو کہ ھدف ہے معاصر حملے کا استدلال پر اپنے ماضی کو سمجھنے کے لیے۔ میں چاہوں گا کہ ابتدا میں یہ وضاحت کردوں کہ استدلال سے میرے ذہن میں کوئی فلسفیانہ تصور نہیں ہے جیسا کہ کانٹ کا تصور استدلال ہے۔ میرے ذہن میں دراصل اس کے وہ معنی ہیں جو اسے عمومی مکالمے میں دیئے جاتے ہیں۔ استدلال میرے لیے ہے دلائل اور منطق کے درمیان تطبیق اور یہ فیصلہ کہ جہاں تک ممکن ہوسکے پہلے سے قائم کردہ مقدمے کے ساتھ نہ بڑھا جائے۔ میں یہ باور کرتا ہوں کہ جو مؤرّخین اپنے ملک کی تاریخ کا یا درحقیقت کسی بھی ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ قبول نہیں کرسکتے کسی بھی مقدمے کو جو کسی مخصوص مذہب، قومی یا نسلی اصولوں پر ہو، لیکن کوشش ضرور کرتے ہیں ایسے نقطۂنظر کے اطلاق کی جو کہ لاگو کرسکے کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی بھی پس منظر سے تعلق رکھتا ہو، کسی بھی مذہب سے، کسی بھی ملک سے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کوشش کرے کہ اپنے ملک کی تاریخ عالمی رائج طریق پر دیکھے: انڈیا کی تاریخ کے مطالعے میں طریقۂ کار، افغانستان کی تاریخ یا انگلینڈ کی تاریخ سے مختلف اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اسلام کی تاریخ کا مطالعہ ہندومت کی تاریخ یا عیسائیت کی تاریخ سے مختلف طریقۂ کار اختیار کرکے نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی بحیثیت مؤرّخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مخصوص مذہب واحد سچا مذہب ہے یا یہ کہ اپنے ملک کے بارے میں صرف اس کا نظریہ ہی قبول کیا جانا چاہیے۔ سنجیدہ مؤرّخین کو ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا اس وقت انگریز مؤرّخین میں عظیم ناموں کے حامل مؤرّخین نے ایک بیان میں کہا کہ اس کی غلطی پورے طور پر جرمنی اور جرمن مؤرّخین پر عائد ہوتی ہے، بشمول تمام بڑے ناموں کے، انہیں رد کیا گیا اس دعوے کے ساتھ کہ تمام تر ذمّے داری مکمل طور پر فرانس اور انگلینڈ پر آتی ہے۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ کتنا آسان ہے ہمارے لیے غیر عقلیت پسندانہ شاونیت کی طرف پھسل جانا، جہاں مؤرّخین ان ممالک کے مطابق واقعات کی توجیہات میں طرف داری کرنے لگتے ہیں جن سے